حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ

اور

مقدمہ ترجمۃ القرآن

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رفیقِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

علمی دنیا میں شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کا نام آفتاب عالمتاب کی طرح مشہور ہے اور ان کی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ نے ان کے درجۂ امامت اور مرتبۂ قیادت کو بلا خلاف علماءِ امت سے تسلیم کرالیا ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی علمی خدمات میں حجۃ اللہ البالغہ سے بھی زیادہ دقیع تالیف قرآنِ حکیم کا فارسی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ اس وقت منصۂ شہود پر آیا جب علمی دنیا میں یہ بحث جاری تھی کہ کلام اللہ کا ترجمہ درست بھی ہے یا نہیں۔

بظاہر اگرچہ یہ مسئلہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا اور علماء کی تنگ نظری کا آئینہ دار نظر آتا ہے لیکن حقیقتِ حال تک پہنچنے کے بعد معاملہ سطحی نظر سے بہت بلند نظر آتا ہے۔

درحقیقت اس بحث یا اس مسئلہ کی بنیاد اس حقیقت پر قائم ہے کہ کسی بھی زبان کا ترجمہ اس زبان کے مکمل مفہوم و معنی کا ترجمان ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ماہرین علم السنہ کا یہ بیان ہے کہ ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ "ادائے حقیقت و روحِ مفہوم کے اعتبار سے" ناممکن ہے۔ تقریبی مفہوم ادا ہو جائے یہ ممکن، لیکن حقیقتِ مفہوم و معنی ادا ہو جائے یہ ناممکن۔ علماءِ اسلام کہتے ہیں کہ مثلاً "الرحمٰن الرحیم" کا ترجمہ لغاتِ عربی میں دونوں اسماء صفات کے خصوصی امتیازات کو دیکھنے کے بعد بھی فارسی یا ترکی یا اردو وغیرہ میں اس طرح نہیں کیا جا سکتا جس سے اس جملہ کی حقیقی روح ادا ہو جائے

علمارِ اسلام ہی اس مسئلہ میں منفرد نہیں ہیں بلکہ علمارِ زمانہ میں بھی محققین میں سے ایک
اعت کا یہی دعویٰ ہے کہ ایک زبان کا دوسری زبان میں حقیقی نہیں تقریبی ترجمہ ہو سکتا ہے۔
پس جب انسانی بول چال کی تراکیب و عبارات کا ترجمہ باہم مختلف زبانوں میں ناممکن
یں تو سخت ترین مشکل سمجھا گیا ہے تو علمارِ اسلام کی ایک جماعت کا اگر یہ خیال رہا ہو کہ کلامِ الٰہی اور
عجاز سے بھی بالاتر عربی کلام کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ناممکن ہے اور اس لئے انھوں نے ترجمہ
ی ممانعت کا فیصلہ کیا ہو تو یہ بات مضحکہ خیز یا تنگ نظری کیسے کہلائی جا سکتی ہے؟
غالباً یہی وجہ ہے کہ علمارِ امت میں سے ایک مختصر اور چھوٹی سی جماعت کا یہ فیصلہ ہے
قرآن فہمی کے بقدر عربی زبان کی معرفت ہر ایک فردِ مسلم کے لئے "فرض عین" ہے۔
البتہ ان علمارِ امت نے اس حقیقتِ ثابتہ کی جانب متوجہ ہونے سے گریز فرمایا کہ قرآنِ
کیم کی دعوت ملکِ عرب ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر ایک گوشہ کے لئے یکساں
عوتِ عام ہے "تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعلمین نذیرا" اور ظاہر ہے کہ
الدین یُسرٌ" کے پیشِ نظر کل کائنات جن و بشر اس کے لئے مکلف نہیں ہو سکتی کہ ہر ایک فرد بشر
ربی زبان کا عالم ضرور ہو اور فرضِ کفایہ، فرضِ عین کی صورت اختیار کرلے۔
نیز یہ کہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عربی زبان کی معرفت ہر فردِ مسلم کے لئے ضروری ہے
ب بھی قرآنِ حکیم کی تعلیمات کا دائرہ محدود ہو کر رہ جاتا اور غیر مسلم تک اس کی حقیقی آواز کا پہنچنا ناممکن
ور دشوار تر ہو جاتا ہے کیونکہ غیر مسلم تو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عربی زبان کو سیکھے اور پڑھے۔ اس لئے
زبس ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو تاکہ اس کی دعوت "دعوتِ عام" اور
عالمگیر دعوت" عملی شکل اختیار کرلے، بیشک یہ بھی لازم ہے کہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ "اصل نظم قرآنی"
باقی رہے۔
اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ کسی زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں حقیقی روح اور مکمل مفہوم کے
ساتھ نہیں ہو سکتا تاہم اس حد تک ضرور ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے کہ نفسِ مفہوم و مراد سمجھ میں آجائے

اور معنی و مراد میں تغیر و تبدل واقع نہ ہو چنانچہ مذہبی اور دینی تراجم کے علاوہ اسی اصول پر علوم
فنون کا اہم ذخیرہ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو کر اپنی مسلمہ افادیت کیلئے شاہدِ عدل
زیرِ بحث مسئلہ کی حقیقت کا یہی رخِ روشن ہے جس کی نقاب کشائی " ولی اللہ دہلوی "
مقدس ہاتھوں نے اس وقت کی جب سب سے بڑی مسلم مملکت ٹرکی کے علماء کے مابین ہنوز
مسئلہ غیر منفصل مباحث کی صورت میں تھا اور خود ہندوستان میں بھی " ترجمۃ القرآن " کا علمی پہ
نمایاں اور روشن نہیں تھا۔

حضرات اہلِ علم اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہیں کہ شاہ ولی اللہ نور اللہ مرقدہٗ
پندرہ سال کی عمر میں تمام علومِ نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل کر لی تھی اور مطالعۂ کتب اور مہارتِ کاملہ
حصول میں اسی وقت سے سرگرمِ عمل تھے۔ ابھی حج بیت اللہ کا عزم نہیں ہوا تھا کہ امامِ امت
قرآنِ حکیم کے ترجمہ کا ارادہ فرمایا، چونکہ اس زمانہ میں حکومت کی سرکاری زبان " فارسی تھی اور اکثر
ذخیرۂ علومِ دینیہ فارسی زبان ہی میں رائج تھا اس لئے شاہ صاحبؒ نے فارسی زبان ہی کو ترجمہ
کے لئے انتخاب فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ ۱۱۴۳ھ میں عازمِ حج بیت اللہ ہوئے۔ اس وقت
سورۂ آلِ عمران تک ترجمہ پہنچ چکا تھا۔ چند سال حرمین الشریفین میں علومِ حدیثیہ و قرآنیہ کے مطا
وحصول میں گزارنے کے بعد ہندوستان واپس تشریف لائے اور ۱۱۵۱ھ میں ترجمہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچ
اور اس کا نام فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن تجویز فرمایا۔

یہ ترجمہ صرف ترجمہ نہیں ہے بلکہ ترجمہ کے رنگ میں مختصر تفسیر اور حقائق و عجائبِ قرآن
عدیم النظیر ذخیرہ ہے۔

چنانچہ اردو زبان کا مایۂ ناز اور مستند ترجمہ جو حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے قلمِ حکمت رقم کا
تحریر ہے بھی فتح الرحمٰن کے استفادہ سے خالی نہیں ہے بلکہ اس کی اساس پر زیرِ قلم آیا ہے اور آج
بھی اہلِ علم کی نگاہ میں یہ فارسی ترجمہ " مدار " اور " مرجع " کی حیثیت رکھتا ہے۔

"فتح الرحمٰن" حضرت شاہ صاحبؒ کی وہ مشہور علمی خدمت ہے جو اپنے تعارف میں کسی وش قلم کی محتاج نہیں ہے اور اس لئے میں بھی اس کے اور اس کی خصوصیات کے متعلق کچھ زیادہ نہیں چاہتا مگر بہت کم اہلِ علم ہیں جن کے علم و خبر میں یہ بات ہے کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ قرآنِ حکیم کا ترجمہ شروع کرنے سے قبل چند صفحات کا ایک مقدمہ بھی تصنیف فرمایا ہے۔

اس مقدمہ کا نام "مقدمہ فی قوانین الترجمہ" ہے اور جلی قلم سے درمیانی سائز کے تقریباً بارہ فحات پر مشتمل ہے۔ نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر یہ مقدمہ ترجمہ کے ساتھ شائع نہ ہوسکا اور آج تک ی مخطوطات میں شامل ہے۔

اس مقدمہ کے پڑھنے سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اگر ایک انب اس راہنمائی کا فرض انجام دے رہے ہیں کہ قرآن حکیم کے ترجمہ میں کونسا اسلوب اختیار کرنا ہے تو دوسری جانب یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے اس مبحث اور اس مسئلہ میں شمع ہدایت کھانا اور قولِ فیصل دینا چاہتے ہیں جس کا ذکر سطورِ بالا میں ہوچکا ہے اور یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں ہ جس طرح دینِ اسلام خود راہِ وسط اور افراط و تفریط کے درمیان کی مستقیم راہ ہے۔ اسی طرح رآنِ حکیم کے ترجمہ سے متعلق بھی یہی راہِ وسط صحیح راہ ہے۔ یہاں نہ انکار و ممانعت کی گنجائش ہے ور نہ آزاد روی کی بالکل صحیح راہ ان دونوں کے درمیان ہے "اِنَّ هٰذا صراطی مستقیماً"

ہم کو یہ مقدمہ اپنے ایک محب صادق کے ذریعہ حاصل ہوا ہے جن کو مخطوطاتِ علمی کا ے حد ذوق ہے اور جو خود بھی اہلِ علم اور اہلِ مطالعہ حضرات میں سے ہیں۔

یہ رسالہ اغلاط سے پُر ہے بلکہ بعض جگہ عبارات کا تسلسل تک مفقود ہے مگر ان باتوں کے وجود افادیت کا حامل ہے اور قرآن حکیم کے ترجمہ سے متعلق اصول و قوانین کے لئے بہترین شعلِ ہدایت اور باوجود اختصار کے اہم نکات و حقائق سے پر بداماں ہے اس لئے اربابِ ذوق قرآنی کی خاطر یہی مناسب معلوم ہوا کہ بعجلت برہان کے ذریعہ اس کو روشناس کرایا جائے اور اصل رسالہ کو کتابت کے نقائص و معائب کے باوجود منصۂ شہود پر لے آیا جائے اور ساتھ ہی اس کا ایسا ترجمہ بھی پیش کردیا جائے جو لفظی پابندیوں سے آزاد اس کے مفہوم و مراد کو پوری طرح آغوش میں لئے ہو۔ اس کے بعد انشاء اللہ جلدی [illegible] کا مقابلہ کر کے سلیس ترجمہ اور مختصر نوٹوں کے ساتھ مستقل رسالہ کی شکل میں پیش کیا جائیگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ واہب العطیات ملہم الحکم والخیرات والصلوٰۃ والسلام الاتمان علی سیدنا محمد معلم اہل المدر والوبر مبین الکتاب بفصل الخطاب وعلی آلہ واصحابہ اجمعین اما بعد فیقول الفقیر الی رحمۃ اللہ الکریم ولی اللہ بن عبدالرحیم ایں رسالہ ایست در قوانین ترجمہ مسماۃ بالمقدمہ فی قوانین الترجمہ کہ وقت تسوید ترجمہ قرآن قلم بضبط آں جاری شد واللہ الہادی الی الحق۔

فصل مترجمین در ترجمہ نویسی طرق مختلفہ دارند بعضی زیر ہر کلمہ ترجمہ آں نویسند وانتقال کنند بکلمہ دیگر وترجمہ آں نیز نویسند وعلیٰ ہذا القیاس کردہ میروند تا آں کلام آخر شود وآنرا ترجمہ تحت اللفظ گویند وجمعی کلام تام را تأمل کنند وتقدیم وتاخیر در مجاز وکنایہ بشناسند ومعنی آں در ذہن خود محصل نمایند پس بہر لغتی کہ خواہند آں معنی محصل را ادا نمایند وایں را بیان حاصل المعنی گویند در طریق اول خللے ہست زیرا کہ بسیار است کہ نظم ترجمہ مختل شود وترکیبی پیدا آید کہ در لغت ترجمہ آنرا صحت نباشد ولا اقل رکاکت وتعقید وارتکاب قلیلہ لازم شود وسبب آں اختلاف لغات است

خدائے کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیم کہتا ہے۔ قرآن کریم کے ترجمہ کے اصول وقواعد میں یہ ایک رسالہ ہے جس کا نام "المقدمہ فی قوانین الترجمہ" ہے، یہ اسوقت ضبطِ قلم میں آیا جب میں ترجمہ قرآن حکیم کا مسودہ کر رہا تھا۔ "واللہ الہادی الی الحق"

فصل۔ کسی بھی زبان کے ترجمہ سے متعلق ترجمہ کرنے والوں کی راہیں مختلف نظر آتی ہیں۔ بعض کا طریق یہ ہے کہ وہ جدا جدا ہر ایک کلمہ کا ترجمہ کرتے جاتے اور تا آخر مضمون تک اسی کے پابند رہتے ہیں کہ ہر ایک کلمہ کا ترجمہ تحت اللفظ رہے اور اس کو "لفظی ترجمہ" کہتے ہیں اور مترجمین کی دوسری جماعت پسندیدہ اسلاف ہے کہ وہ اول پورے کلام میں غور وتامل سے کام لیتے۔ "مجاز" و "کنایہ" میں تقدیم وتاخیر

در تقدیم بعض اجزاءِ کلام بر بعض و در تالیف کلمات و استعمال کنایات و اطلاق صلات و در بعض لغات انتقال از لازم بملزوم و آں استعارہ لفظی بجائے لفظے صحیح نباشد و در لغت دیگر اصلاً صحیح نبود در عربی گویند فلاں عظیم الرماد و آنرا بسخاوت انتقال کنند و اگر در فارسی فلاں بزرگ خاکسترست فارسیاں بآں معنی انتقال نمایند و در لغت عربیہ گاہی خصوصیتی

کی معرفت چاہتے، اور اس ترتیب کے ساتھ عبارت کے معنی کو ذہن نشین کرتے ہیں۔ بعد ازاں اپنی صوابدید پر ان معانی کو موزوں اور مناسب الفاظ اور بندش کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اور اس ترجمہ کو "بیان حاصل معنی" (آزاد ترجمہ یا معنوی ترجمہ) کہا جاتا ہے۔ لیکن ترجمہ کا طریقِ اول نقص و خلل سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے کہ لفظی ترجمہ میں اکثر و بیشتر ترجمہ کا نظم درہم و برہم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اصل مضمون میں ایسی ترکیب ہوتی ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کے لغت میں اس ترکیب کا ترجمہ صحیح طور پر ناممکن ہوتا ہے اور کم از کم کلام میں رکاکت، تعقید (گنجلک) اور اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے ارتکابات تو ضرور ہی پیش آجاتے ہیں، اور اس صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ مختلف زبانوں میں بعض اجزاء کلام کی بعض پر تقدیم کا اسلوب قطعاً الگ الگ ہے، اور کلمات کی ترکیب، کنایات کے استعمال اور صلات کے اطلاق میں بھی جدا جدا نہج پائے جاتے ہیں۔ نیز بعض زبانوں میں لازم سے ملزوم کی جانب یا ملزوم سے لازم کی جانب منتقل ہونا اور ایک خاص لفظ کا دوسرے خاص لفظ کو استعارہ کرنا صحیح نہیں ہوتا اور دوسری زبان میں اصل و حقیقت کے لحاظ سے ہی وہ لفظ (اس جگہ) درست نہیں بیٹھتا مثلاً عربی زبان میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص "عظیم الرماد"[1] ہے اور یہ کہہ کر اس شخص کی "سخاوت" مراد لیتے اور اس مفہوم میں منتقل کر لیتے ہیں، پس اگر فارسی زبان دان اس کا ترجمہ "بزرگ خاکستر" کر کے معنی "سخاوت" کو ادا کرنا چاہیں تو یہ قطعاً نادرست ہوگا۔ اسی طرح

---

[1] بہت راکھ رکھنے والا۔ عظیم الرماد یا کثیر الرماد۔

ملحوظ باشد کہ در فارسیہ کلمہ باں خصوصیتی یافتہ نشود مانند رعار الابل وخوار البقر وصہال الفرس ونواح التیس ویعار المعز ونہق الحمار ونباح الکلب وہدیر الحمام و مانند جرد الکلب وجر الفشا شبل الاسد وفصیل الابل وجدی البقر وعناق الشاۃ در لغت فارسیہ لفظے کہ بازاء ایں خصوصیات مستعمل نباشد بے تکلف یافتہ نمی شود وہمچنیں در اصلہ افعال اختلاف بسیار واقع است الی غیر ذلک مما لا یخفی علی المتفطن اللبیب ودر طریق ثانی نیز خللے ہست بسا است کہ کلام محتمل دو وجہ باشد مترجم متفطن نشود بگر توجہی کہ مراد متکلم واگر حقیقت امر یہی اکثر تحریف در کتب سابقہ

عربی زبان میں ایک ہی لغت کے لئے ایسی خصوصیات ملحوظ ہوتی ہیں جن کا فارسی زبان میں فقدان ہے مثلاً حیوانات کی آوازوں کے لئے عربی زبان میں یہ امتیازات ہیں۔ رعار الابل، (اونٹ کا بلبلانا) خوار البقر (گائے بیل کا رینکنا) صہال الفرس (گھوڑے کا ہنہنانا) ثواج التیس (مینڈھے کا بولنا) یعار المعز (بکری کا میں میں کرنا) نہق الحمار (گدھے کا ہینچنا) نباح الکلب (کتے کا بھونکنا) ہدیر الحمام (کبوتر کا غٹرغوں کرنا) اور اسی طرح جرد الکلب (کتے کا پلا) شبل الاسد (شیر کا بچہ) فصیل الابل (اونٹ کا بچہ) جدی البقر (گائے کا بچھڑا) عناق الشاۃ (بکری کا بچہ)

اور فارسی لغات میں چونکہ ان خصوصیات وامتیازات کے لئے علیحدہ علیحدہ لغات مستعمل نہیں ہیں اس لئے ان عربی لغات کے ترجمہ میں جدا جدا خصوصی اور امتیازی لغت بے تکلف حاصل نہیں ہو سکتے۔ پھر ان اختلافات کے علاوہ اصل افعال میں بھی بہت سا اختلاف موجود ہے غرض اس قسم کے اختلافات ہیں جو مختلف زبانوں اور لغتوں میں پائے جاتے ہیں اور ایک عاقل وذہین انسان پر یہ حقیقت بخوبی روشن ہے۔

دوسرا طریقہ بھی خلل وفساد سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ اکثر وبیشتر یہ ہوتا ہے کہ کلام میں دو مستقل وجوہ کی گنجائش ہے اور مترجم اس درجہ حاذق اور ماہر نہیں ہے کہ ان ہر دو وجوہ میں سے متکلم کی مراد کو پا سکے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ مترجم مرادِ متکلم کے خلاف ترجمہ کردے گا اور اگر

ازیں سبب راہ یافت۔ پس لازم در ترجمہ کلامِ الٰہی بقاءِ آں نظم است کہ اگر مترجم را در بعض مواضع لغزشی پدید آمدہ باشد من بعد کسی تدارک آں نماید، فرب مبلغ اوعی لہ من سامع و در توجیہ مواضع مشکلہ و تاویل متشابہات و امثال آں علماء مذاہب مختلفہ دارند و اگر بنظر تحقیق بنگری ایں ہمہ مذاہب اصل شرع نیست بلکہ نوعی از موشگافیست در شرع باستعانۃ عقل پس اگر ہر یکے حسب فہم تاویل میکردو آں نظم باقی نمی ماند اصل شرع کم می شود نیز چوں قرآں بلغت عرب نازل شدہ و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہ لغتِ عرب سخنی فرمودہ اند امراست بدون معرفت لغت عرب مستقیم نشود پس برامت مرحومہ معرفت لغت عرب واجب

حقیقت امر پوچھتے ہو تو کتب سابقہ میں تحریف نے اکثر اسی سبب سے راہ پائی ہے۔ پس کلامِ الٰہی کے ترجمہ میں یہ ازبس ضروری ہے کہ کتاب الٰہی کا نظم بحالہ باقی رہے (یعنی کلامِ الٰہی کے ترجمہ میں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ اصل کلامِ الٰہی کا مکتوب ہونا فرض ولازم ہے تاکہ تحریف سے محفوظ رہے) اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اگر اصل "نظم کلام" باقی ہے اور مترجم سے بعض مواقع میں لغزش ہوگئی ہے تو دوسرا شخص بفحوائے حدیث "فرب مبلغ اوعیٰ لہ من سامع پس بسا وہ شخص جس تک بات پہنچائی گئی ہے براہِ راست سننے والے کے مقابلہ میں اس بات کو محفوظ رکھنے اور اس کی تہ تک پہنچنے میں زیادہ محافظ مآب ہوتا ہے"۔ اس غلطی کا تدارک کرسکتا ہے پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مشکل مواقع اور ابہامات و مجملات کے منشار کی توجیہ اور اسی قسم کے دوسرے امور میں علماءِ اسلام مختلف مسلک رکھتے ہیں اور اگر بہ نظرِ تحقیق دیکھا جائے تو علماء کے یہ تمام مسلک "اصل شرع" نہیں ہیں بلکہ عقل وخرد کی استعانت سے شرع کے مسائل میں ایک قسم کی موشگافی ہے پس اگر ہر ایک عالم اپنے فہم وتدبر کے مطابق توجیہ بیان کرے اور "اصل نظمِ کلام الٰہی" باقی نہ رہے تو اصل شرع میں کمی آتی چلی جائے گی۔

نیز جبکہ قرآن عظیم لغتِ عرب پر نازل ہوا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی

بالکفایہ شد و ہر کسے را معرفت آں مسنون و مندوب آنگہ بہ لغت عربی آشنا نیست، باعتبار معرفت دین محمدی او را در عداد زندگانی نتواں شمرد و در حساب مردماں نتواں آورد ملحق بجمادات و داخل در عداد اموات و عجزی بر خود لازم کردہ است کہ شرع آنرا مرحوم نکرد و ہوائے بر خود تجویز نمودہ است کہ شرع آنرا سر بلند نہ ساخت و لہذا در تلاوت قرآن و ذکر خدا تعالیٰ و خطبہ عید و جمعہ لغتِ فارسیہ جائز نداشتند ہر چند مقصود ازیں تدبر و احفاظ است نہ خصوصیت الفاظ پس مقصود اہم از ترجمۂ قرآن عظیم آنست کہ خواننده را اندرکے حاصل شود در معرفت

لغت عرب ہی میں گفتگو فرمائی ہے۔ پھر امتِ مرحومہ کا معاملہ (دینی و دنیوی) لغتِ عرب کی معرفت کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ اس لئے امتِ مرحومہ پر لغتِ عرب کی معرفت واجب بالکفایہ ہوئی اور ہر فرد مسلم کے لئے اس کی معرفت مسنون و مستحب قرار پائی۔

جو شخص لغتِ عرب سے ناآشنا ہے دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کے پیشِ نظر اس شخص کا شمار زندہ انسانوں میں بلکہ انسانوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو جمادات کی طرح سمجھا جاتا اور اس کا مردوں میں شمار ہوتا ہے، اس نے خود پر اس عجز کو لازم کر لیا ہے کہ شرع نے اس کو رحمت سے محروم رکھا اور اپنے لئے اپنی خواہشِ نفس سے یہ تجویز کر لیا ہے کہ شرع نے اس کو سربلندی نہ بخشی

بہر حال لغتِ عرب کی معرفت کا لزوم ہی اس حقیقت کا سبب بنا کہ تلاوت قرآنِ عظیم ذکرِ خدائے برتر، اور خطبۂ عید و جمعہ میں لغتِ فارسی کو جائز نہیں رکھتے۔ اگرچہ ان امور کا مقصد تحصیل عبرت و بصیرت اور پند و نصیحت ہے خصوصیتِ الفاظ نہیں تھے۔ پس قرآنِ عظیم کے ترجمہ کا اہم مقصد یہ ٹھیرا کہ پڑھنے والے کو نظمِ قرآن کی معرفت میں "ندرت" اور کلام اللہ کی عبارت میں غور و خوض سے "ملکہ" حاصل ہو تا کہ اس کی بدولت وہ قرآنِ عظیم کے فوائد عالیہ تک پہنچ سکے اور یہ معنی ترجمہ کے اس دوسرے طریق "بیان حاصل معنی" میں مفقود ہیں۔

آن و ملکہ بدست آید از خوض در عبارت آں و ایں معنی در بیان حاصل المعنی مفقود است
ون خلل در ہر دو وجہ ملاحظہ نمودند جمع کردند در ترجمۂ تحت اللفظ و تقریر حاصل معنی تا اگر تعقید
تے در تحت اللفظ حاصل شدہ باشد متدارک گردد بکلام دیگر کہ تقریر مدعا نماید بغیر تعقید
لتے واگر در تقریر معنی باختیار احد الوجہیں یا بتاویل متشابہ خلل راہ یافتہ باشد باطلاق تحت
علاج آں کردہ وایں طریق نیز بر مذاق اصحاب ذوق سلیم بشاعتے دارد تشویش بمبتدی میدہد
رابکار نمی آید و تطویل لازمش میشود و سخن از نسق طبیعی خود بر می آید و اگر بنگاہ بنگاہ فے منشار

پھر ایک جماعت نے ان دونوں راہوں سے جدا ایک تیسری راہ اختیار کرلی۔ انھوں
ب دیکھا کہ مسطورہ بالا دونوں اسالیب میں خلل اور نقص پایا جاتا ہے تو ان دونوں کو ملادیا
ب سے دوسری وجہ کا جبر نقصان ہو کر مطلب و مقصد حاصل ہوسکے۔ چنانچہ انھوں نے
ی ترجمہ" اور "بیان حصول معنی" دونوں کو اپنالیا تاکہ جس وقت تحت اللفظ ترجمہ کی وجہ سے
(گنجلک) اور رکاکت پیدا ہو جائے تو دوسرے طریق یعنی مفہوم و مراد کے بیان و تقریر کے
س کا تدارک کردیا جائے اور اگر جملہ اور عبارت میں موجود دو وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کو
ہ کی کسی خاص توجیہ کو اختیار کرکے مفہوم و مراد بیان کرنے میں خلل اور فساد پیدا ہو جائے
کا علاج تحت اللفظ ترجمہ سے کردیا جائے۔
ظاہر ہے کہ یہ تیسرا طریقہ بھی اصحاب ذوق سلیم کے مذاق کو قطعاً خلاف اور معیوب ہے
طریقہ مبتدی کے لئے تشویش کا باعث اور منتہی کے لئے بے کار اور غیر مفید نیز تطویل لاطائل
ب ہے اور اس طرح کلام اپنے نسقِ طبعی سے خارج ہو جاتا ہے۔
اور اگر اس طریقہ کے اختیار کرنے کی حقیقت تک رسائی مقصود ہے تو صاف بات
ہ اس طریقِ کار کے اختیار کرنے کا مقصد ہر دو لغات و زبان کے رسم کلام سے درماندگی اور
ہے (یعنی وہ ترجمہ کی زبان اور عربی زبان دونوں کے رسم کلام اور فروقِ لغات کے

آں عجز است وجہل از رسمِ تکلم ہر دو لغت ایں فقیر چوں بریں طرقِ ثلاثہ مطلع شد و خللے کہ درمیان آنہاست ملاحظہ نمود حریص شد بر اختراعِ طریق رابع کہ جامع باشد میان منافع طرق ثلاثہ و خالی بود از خلل آنہا ترجمہ تحت اللفظ را بیکدست گرفت و خللہا را یاد داشت و تصرف در فنون آں منظور نظر نمود و بیانِ حاصل معنی را بدست دست دیگر گرفت و مواضع صعوبہ فہم مراد و طریق مخلص از آنہا بسہولت او را ضبط کرد پس نخست بترجمہ تحت اللفظ مقید شد بہ ہماں نظم کہ در قرآن مذکور است و اختلاف صلات فعل را بر خود ہموار نمود و در آنجا کہ تعقید و رکاکت آں ترجمہ فارسیہ

فہم سے عاجز و درماندہ ہونے کی وجہ سے بہ طویل راہ اختیار کرنے پر مجبور رہے)۔

غرض ترجمہ کے لئے یہ تینوں طریقے خلل و فساد اور نقص و عیب سے خالی نہیں ہیں یہ فقیر جب ان ہر سہ طریق پر مطلع ہوا اور ان میں جو خلل و فساد پایا جاتا ہے اس کو دیکھا تو جی چاہا کہ ان راہوں سے جدا ایک چوتھی راہ ایسی پیدا کی جائے کہ جس میں مسطورہ بالا ہر سہ طرق کے فوائد کے لئے جامع ہو اور ان میں جو خلل و فساد کی صورتیں ہیں ان سے محفوظ ہو چنانچہ میں نے ایک ہاتھ میں تو ترجمہ لفظی لیا اور ساتھ ہی اس کے مفاسد کو بھی پیشِ نظر رکھا اور اس سلسلہ میں مختلف طریقہائے تصرف کو زیرِ نظر لایا اور بیان حاصل معنی (حاصل ترجمہ) کو دوسرے ہاتھ میں لیا اور فہم مراد کے مشکل موقعوں کو اور بسہولت ان سے رستگاری کے طریقوں کو منضبط کیا اور یہ سب کچھ پیشِ نظر رکھنے کے بعد ترجمہ کی داغ بیل اس طرح ڈالی کہ اول اس طرح لفظی ترجمہ کیا کہ نظمِ قرآنی کے ساتھ پوری طرح مطابقت قائم رہے اور ساتھ ہی لحاظ رکھا کہ افعال کے صلات کا جو اختلاف ہے اس کو اپنے فہم سے درست کیا جائے اور جس جس مقام پر فارسی کے ترجمہ لفظی میں رکاکت اور تعقید و گنجلک لازم آگئی یا لغتِ عربی میں ایسی ترکیب واقع ہوئی ہے کہ اس کے نظیر لغتِ فارسی میں نہیں پائی جاتی ہے تو ان مواقع میں عربی زبان ہی سے ایسے مرادف الفاظ و کلمات کے ذریعہ ترجمہ کر دیا ہے جو اصل کی قائم مقامی کر سکیں۔ مثلاً اسمِ فاعل استقبال کے لئے

لازم آمد یا در لغت عربیہ ترکیبی واقع شدہ است کہ نظیر آں در لغاتِ فارسیہ یافتہ نمی شود حرفِ مساوی آں از حروفِ عرب بجائے او اقامت نمودہ ترجمہ آں نوشت مثلاً اسم فاعل برائے استقبال باشد حرف مساوی او فعل مستقبل معلوم است و اسم مفعول کہ برائے استقبال باشد حرف مساوی او فعل مستقبل مجہول است مثلاً قل یاایھا المومنون یا ھؤلاء المومنین در یک حالست فمالھم من ناصرین فمالھم من ناصر یک نسق است زیرا کہ از ناصرین این جا عموم جموع مراد نیست بلکہ افراد است، لہذا در دین ما رخصت حاصل شد در قرأت قرآن بہفت حرف و صحابہ تفسیر لفظی بحرف موافق تجویز نمودند و ملاحظہ تقدیم ماحقہ التقدیم و تاخیر ماحقہ التاخیر و اظہار مقدر و ترک مفخم و تبیین نحو از دست ندادند اگر صعوبۃ فہم مراد لازم آید مہما امکن قصد نمود کہ با دنی تصرفے از تقدیم و تاخیر و زیادۃ حرفی یا اظہار مقدری یا اعادۂ عامل

آتا ہے تو فعل مستقبل معلوم اس کا مساوی ہوتا ہے نیز اسم مفعول جو استقبال کے لئے لایا جاتا ہے تو اس کا مساوی فعل مستقبل مجہول ہوتا ہے جیسا کہ قل یاایھا المومنون یا ھؤلاء المومنین بلحاظ معنی ایک حال میں ہیں (یعنی اے ایمان والو! یا اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو) دونوں جملے ہم معنی ہیں۔ اور اسی طرح ..... فمالھم من ناصرین اور فمالھم من ناصر دونوں کا ایک ہی نسق ہے اس لئے کہ اس جگہ ناصرین سے عموم جمع مراد نہیں بلکہ افراد مراد ہیں (پس ناصر اور ناصرین ہم معنی ہوئے)۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے دین حقہ میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ ہم سات حروف (لغات عرب) میں سے جس حرف (لغۃ) میں چاہیں قرآنِ حکیم کی قرارت کر سکتے ہیں اسی بناپر صحابہ رضی اللہ عنہم نے تفسیر لفظی موافق لغت کے ساتھ جائز رکھا ہے۔ میں نے ترجمۂ قرآنِ حکیم میں اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے کہ جس لفظ یا جملہ کا حق مقدم یا مؤخر ہونے کا ہے وہ مقدم و موخر ہی رہے اور یہ کہ مقدرات کو ظاہر کر دیا جائے اور ترخیم کا ترک اور تبیین

پر سر معطوف یا باظہار مضمری و اضمار مظہری آں صعوبت را حل نمود و اگر طبیعت کلام ازیں تص
ابا می کند بعد ادائے ترجمہ لفظ حاصل معنیٰ را بلفظ یا مراد آنست معلم نمودہ مذکور کرد و اگر ذکر قید
یا مجمل کلامے یا حل کنایتے یا کشف تعریفی یا تسمیہ مبہمی ضرورست آنرا نیز بلفظ یعنی مراد آنس
معلم نمود خوانندہ۔ سعادتمند را باید کہ بعد ذکر آنچہ در چیز یعنی واقع است اعادہ کند کلمہ سا
را با کلام مربوط نماید بالجملہ مواضع اختلاف لغتین بسیار است از انجملہ آنکہ رسم عرب اس
کہ نخست معنی را بنوعی از اجمال و اختصار بیان کنند بعد ازاں تفصیل و تبیین آں کنند و ایں تفصیل
بعد اجمال پیش ایشاں لذتے کم از ذکر کلام بنہج تفصیل یافتہ نشود مثلاً گویند ضربت زیداً ر
سہ حسن زیدا دارا ان احد استجارک زیداً ضربت پس در ضربت زیداً راسہ و سلبت زید

(اظہار) جیسے نحوی مسائل کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے اور اگر فہم مراد میں مشکل پیش آگئی تو حتی ال
یہ قصد وارادہ کیا کہ تقدیم و تاخیر اور مقدرات کے اظہار میں ایک لفظ کا اضافہ یا معطوف پر عامل ک
اعادہ یا مضمر کا اظہار یا مظہر کا اضمار اس قسم کے ادنیٰ تصرف کے ذریعہ سے اس صعوبت کو حل
کر دیا جائے اور اگر کلام کا مزاج اس قسم کے تصرف سے ابار (انکار) کرتا ہے تو لفظی ترجمہ کے
بعد حاصل معنی کو لفظ "یا مراد آنست" یا یہ مراد ہے" کا نشان دیکر ذکر کر دیا ہے۔ اور اگر کسی لفظی
قید کا ذکر کسی کلام مجمل کی تفصیل، کسی کنایہ کا حل، کسی لفظ کے معرفہ ہونے کا کشف، یا کسی مبہم
کا ازالۂ ابہام ضروری معلوم ہوا تو ان کو بھی "یا مراد آنست" کہکر بیان کر دیا ہے اس لئے
سعادتمند صاحب مطالعہ کے لئے ازبس ضروری ہے کہ ترجمہ کے جب اس مقام پر پہنچے جہاں
لفظ "یعنی" مذکور ہے تو کلمہ سابق کا اعادہ کر کے اصل کلام کے ساتھ اس کو مربوط کرلے (اور معنی کو
شرح و وضاحت کی حیثیت میں مطالعہ کرے)

غرض عربی اور فارسی لغات (زبان) کے مابین مواقع اختلاف اکثر و بیشتر ہیں منجملہ ان کے
ایک یہ ہے کہ اہل عرب کا دستور ہے کہ اول کسی مطلب کو اجمال و اختصار کے ساتھ بیان کرتے

ثوبہ مبادرت کنند باثبات حکم زیدرا ودر حقیقت ثبوت حکم زیدرا بحال متعلق باشد پس عود کنند
وتدارک آں تسامح نمایند و ہمچنیں حسن زیدرا اثبات کردند و بحقیقت حسن زید ثابت است
بواسطۂ متعلق او پس عود کردند وآں را درصورۃ تمیز تدارک نمودند ولہذا گفتہ اند کہ تمیز از نسبت محول
است از فاعل یا مفعول ودراں احد اضمار نمودند استجار را ودر زیداً ضربت اضمار نمودند
ضربت را بعدازاں تدارک خللی کہ در اضمار حاصل شدہ بتقدیم رسانیدہ اند وایں تصرف در زبان
عجم مالوف نیست وازاں جملہ آنکہ عرب قصد کنند بجملہ وآں را تغیری دہند واز سنن طبعی معدول

اور بعدازاں اس کی تفصیل وتبئین کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور ان کی نظر میں یہ تفصیل بعداز
اجمال اس سے کم لذت اندوز نہیں ہے کہ ابتدا ہی میں وہ تفصیل کے ساتھ کلام کو بیان
کردیں مثلاً وہ کہا کرتے ہیں "ضربت زیداً راسہ - میں نے زید کے سر پر مارا" حسُن زیداً داراً - زید کا
گھر اچھا ہے" "ان احد استجارک، اور اگر کوئی تجھ سے پناہ چاہے" پس "ضربت زیداً راسہ" اور "سلبت
زیداً ثوبہ" میں بعجلت اول زید پر حکم ثابت کرتے ہیں اور درحقیقت مقصد یہ ہوتا ہے کہ زید کے متعلقات
پر حکم صادر کریں اس لئے اس تسامح کا تدارک کرنے کے لئے پھر اس متعلق کو بیان کرتے ہیں اس
طرح حسنِ زید کا اول اثبات کرتے ہیں اور حقیقت میں حسنِ زید کا اثبات اس کے متعلق یعنی
دارِ زید کے ذریعہ مقصود ہوتا ہے اس لئے پھر رجوع کرتے ہیں اور تمیز نحوی کی شکل میں اس کا تدارک
کرتے ہیں یعنی جب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زید کا گھر بہت خوبصورت ہے تو اس کی تعبیر یوں کرتے
زید حسین ہے اپنے گھر کے اعتبار سے) اور اس بنا پر (اہلِ لغت) یہ کہتے ہیں کہ تمیز از نسبت محول ہے
فاعل یا مفعول سے اور "ان احد" میں "استجار" کو مضمر اور پوشیدہ اور "ضربت زیداً" میں
"ضربت" کو مضمر تسلیم کرتے ہیں اور بعدازاں اضمار کی وجہ سے کلام میں جو خلل پیدا ہوجاتا ہے اس
کا تدارک اس طرح کرتے ہیں کہ کلام کے شروع میں اس مقدر کو ملحوظ مان لیتے ہیں اور ظاہر
ہے کہ اس قسم کا تصرف عجمی زبان میں مانوس نہیں ہے۔

نمایند چنانکہ وعداللہ وسبح اللہ وسقاک اللہ بود ودروی تصرفے کردند بجائے فعل مصدر راقائم
نمودند وآنرا بمعمول فعل خواہ فاعل یا مفعول باشد بواسطہ حرف جر خواہ بیواسطہ مضاف نمودند
پس گفتند وعداللہ حقاً وسبحان اللہ وسقیا لک وزبان عجم بنظرایں تصرف آشنا نیست وازا
جملہ آنست کہ منکر را درصورت معرف گویند ومفکوک من الاضافہ را درصورت مضاف برا
حصول تخفیف در لفظ وغرض ایشاں ہماں معنی اصلی بود وازاں جملہ آنست، کہ خواہند کہ یک
مضمون را دو بار عرضہ دہند بنوعے از سہولت ادا پس آں تکرار را ازاول منوت سازند گو

ازانجملہ اہلِ عرب جب ایک جملہ بولنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس میں ایک خاص قسم کا
تغیر کرتے ہیں اور جملہ کو اس کے اصل مزاج سے ہٹا کر استعمال کرتے ہیں مثلاً "وعداللہ" "
"سبح اللہ" "وسقاک اللہ" (اللہ نے وعدہ کیا ہے، اللہ پاک ہے، اللہ تجھکو سیراب کرے) ہے، پس
اس میں وہ تصرف کرتے ہیں اور فعل کی جگہ مصدر کو قائم مقام بنادیتے ہیں اور پھر اس کو فعل کے معمو
کے ساتھ خواہ وہ فاعل ہو یا مفعول بواسطہ حرف جر یا بلا واسطہ مضاف کردیتے ہیں اور یوں کہتے
ہیں "وعداللہ حقا" "سبحان اللہ" "سقیا لک"۔ مگر عجمی زبان اس قسم کے تصرف سے مطلق آشنا
نہیں ہے۔ اور منجملہ دوسرے تصرفات کے ایک تصرف یہ ہے کہ لفظ منکر کو (نکرہ) معرف (معرفہ)
کی صورت میں بولتے ہیں اور جس جملہ سے اضافت محو کردی گئی ہو اس کو مضاف کی صورت
میں۔ اس لئے بولتے ہیں کہ لفظ میں تخفیف حاصل ہوجائے دراں حالیکہ ان تصرف کرنے والوں کی
غرض ان تصرفات کے باوجود وہی معنی ہی ہوتے ہیں۔

اور منجملہ تصرفات کے ایک تصرف یہ ہے کہ کبھی وہ یہ چاہتے ہیں کہ ایک مضمون
کو دو مرتبہ پیشِ نظر لائیں۔ اور سہولت ادا بھی ہاتھ سے نہ جائے پس یہ کرتے ہیں کہ اس تکرار
کو اول کے ساتھ متفق کردیتے ہیں، مثلاً بعض کہتے ہیں ھواعلمھم علما واحلمھم حلما
وزید ابولک عطوفا وتبسم ضاحکا وقام قائما والذاریات ذروا، والصافات

اعلمهم علما واحلمهم حلما وزید ابوك عطوفا وتبسم ضاحكا وقام قائما - و
ریات ذروا، والصافات صفا - واین چیز ہا در عجم مستعمل نیست وازاں جملہ آنست کہ قصد
بجملہ تامہ وصورت آنرا تغیر دہند بتسلیط فعلی یا حرفی براجزائے آں جملہ گویند ما کان زید
عل ہذا وانما ضرب زید وظننت زیدا قائما ودر فارسی آں عامل را براجزائی جملہ مسلط نکنند
روی جدا تقریر کنند گویند دانستم کہ زید قائم است نگویند دانستم زیدرا ایستادہ وجزیں نبود
زید زدہ ہرگز نیست کہ زید چنیں کند وازاں جملہ کہ در عربی گویند قام زید ودر فارسی گویند
یرا ایستادہ واگر گویند ایستادہ زید رکیک باشد وازاں جملہ آنست کہ در فارسی حکایۃ حال
ضی بداخل کردن حرف می بر ماضی متحقق شود گویند می کرد می زد ودر عربی بدون استعارۂ کان

صفا اس قسم کا تصرف عجمی زبان میں مستعمل نہیں اور منجملہ تصرفات کے ایک تصرف یہ ہے کہ اہل
رب جملہ تامہ کا ارادہ کرتے ہیں مگر اس کی صورت کو اس طرح بدل دیتے ہیں کہ کسی فعل یا حرف
اجزار جملہ پر مسلط کر دیتے ہیں مثلاً کہتے ہیں ما کان زید لیفعل ھذا وانما ضرب زید و
ظننت زیدا قائما - اس کے برعکس فارسی زبان میں اس قسم کے عامل کو جو عربی زبان میں
عل یا وقت کی زبان میں نمودار ہوتا ہے - اجزار جملہ پر مسلط نہیں کرتے بلکہ اس کو جدا لاتے ہیں
اور یوں کہتے ہیں "دانستم کہ زید قائم است" اور یوں نہیں کہتے "دانستم زیدرا استادہ"
اور ازانجملہ یہ کہ عربی میں "قام زید" کہتے ہیں اور فارسی میں زیدا ستادہ کہتے ہیں پس اگر
قام زید کی طرح فارسی بھی ایستادہ زید کہے - تو یہ جملہ رکیک ہوجائے گا - اور ازانجملہ یہ کہ
فارسی میں حال ماضی کی اگر حکایت کریں تو ماضی میں "می" داخل کرنے سے معنی متحقق ہوجاتے
ہیں اور یوں کہتے ہیں میکرد، میزد - مگر عربی زبان میں جب تک لفظ کان کو اپنے اصل حقیقت س
ہٹا کر مستعارنہ لیا جائے حکایت حال ماضی کے معنی درست نہیں ہوسکتے - مثلاً یوں کہیں گے
کان یفعل -

راست نیاید کان یفعل وازاں جملہ آنست کہ فعل مضارع در عربی خبر می تواند واقع شدہ از جعل وکاد ومثال آں بخلاف زبان عجم وہمچنیں در عربی جملہ خبر اسمی واقع شود۔ گویند زید قام ابوہ در فارسی بدون تکلف راست نباید۔

اسی طرح یہ کہ عربی میں فعلِ مضارع جَعَلَ اور کاد کی خبر واقع ہو سکتا ہے برخلاف فارسی کے کہ اس میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی عربی میں جملہ اسم کی خبر واقع ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں زید قام ابوہ اور یہ صورت، فارسی میں تکلف کے بغیر درست نہیں ہوتی۔

(باقی آئندہ)

قرآن اور تصوف

۴۵ء کی بلند پایہ علمی اور تحقیقی کتاب

تالیف جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ رفیقِ اعزازی ندوۃ المصنفین دہلی

ڈاکٹر صاحب نے اس گراں مایہ تالیف میں حقیقی اسلامی تصوف کو منطقی ترتیب و وضاحت کے ساتھ ایک خاص اسلوب میں پیش کیا ہے۔ کتاب و سنت کے منشا، و ماخذ کی روشنی کتاب کی جان ہے۔ قابل مطالعہ کتاب ہے۔ بڑے بڑے عنوانات ملاحظہ ہوں۔

عبادت و استعانت، قرب و معیت، تنزلاتِ ستہ، خیر و شر، جبر و قدر، یافت و شہود

قیمت دو روپے۔ مجلد تین روپے۔

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ